ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2962

Program: BS (Islamic Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(شعبہ شریعہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ)

کورس: فقہ المعاملات (2962) • سطح: بی ایس (علوم اسلامیہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ: 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: معاشیات کی تعریف، آغاز وارتقاء، نفسِ مضمون اور قبل از اسلام طائف کی معاشی سرگرمیاں (20 نمبر)

سوال نمبر 1: معاشیات کی تعریف، آغاز وارتقاء، نفس مضمون اور اسلام سے قبل طائف کی معاشی سرگرمیوں پر نوٹ لکھیں۔ (20 نمبر)

تعارف

معاشیات انسانی زندگی کے سب سے قدیم اور مسلسل مسائل سے بحث کرنے والا علم ہے، کیونکہ روزی روٹی، پیداوار، تبادلہ اور تقسیمِ دولت کے سوالات ہر دور میں ہر معاشرے کے سامنے رہے ہیں۔ فقہ المالیات کے طالب علم کے لیے معاشیات کی تعریف اور اس کے تاریخی ارتقاء کو سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت کا تقابل جدید نظاموں سے اسی پس منظر میں درست طور پر ہو سکتا ہے۔ اس جواب میں پہلے معاشیات کی تعریف بیان کی جائے گی، پھر اس علم کے آغاز و ارتقاء کے بڑے ادوار کا جائزہ لیا جائے گا، اس کے بعد اس کے نفسِ مضمون یعنی دائرہ بحث کو واضح کیا جائے گا، اور آخر میں اسلام سے قبل کے شہر طائف کی معاشی سرگرمیاں بیان کی جائیں گی، جو جزیرہ نما عرب کی زرعی و تجارتی زندگی کی ایک نمایاں مثال ہے اور جس ماحول میں اسلامی معاشی تعلیمات نازل ہوئیں اسے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

معاشیات کی تعریف

لفظ معاشیات عربی لفظ عیش اور معاش سے ماخوذ ہے جس کے معنی زندگی گزارنے اور روزی حاصل کرنے کے ہیں، اور انگریزی اصطلاح اکنامکس یونانی لفظ اوئیکونومیا سے نکلی ہے جس کے معنی گھر کے انتظام کے ہیں۔ اصطلاحی تعریفیں ہر دور کے مفکرین نے اپنے زاویہ نگاہ سے کی ہیں۔ ایڈم سمتھ نے 1776ء میں معاشیات کو دولت کی نوعیت اور اس کے اسباب کی تحقیق قرار دیا، اس لیے اسے علمِ دولت کہا گیا۔ الفریڈ مارشل نے اسے انسانی فلاح کا علم قرار دیتے ہوئے کہا کہ معاشیات زندگی کے معمول کے کاروبار میں انسان کا مطالعہ ہے اور اس کا تعلق فلاح کے مادی وسائل کے حصول و استعمال سے ہے۔ لائنل رابنز نے 1932ء میں قلت کی تعریف پیش کی کہ معاشیات وہ علم ہے جو لامحدود خواہشات اور متبادل استعمال رکھنے والے محدود وسائل کے درمیان انسانی رویے کا مطالعہ کرتا ہے۔ جدید ماہرین، مثلاً سیموئیلسن، ان تعریفوں کو ملا کر کہتے ہیں کہ معاشیات اس بات کا مطالعہ ہے کہ معاشرے محدود وسائل کو مختلف اشیاء کی پیداوار اور ان کی تقسیم میں کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے معاشیات کی جامع تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ وہ علم ہے جو انسانی معاشی رویے کا مطالعہ شریعت کے اصولوں کی روشنی میں کرتا ہے تاکہ حلال وسائل سے انسانی ضروریات کی تکمیل اور معاشرے کی عمومی

فلاح حاصل ہو۔ ان تمام تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے کہ وسائل کی قلت، انتخاب کا مسئلہ اور انسانی فلاح اس علم کے تین مرکزی نکات ہیں، البتہ اسلامی تعریف میں حلال و حرام کی قید اور آخرت کی فلاح کا تصور اسے مغربی تعریفوں سے ممتاز کرتا ہے۔

معاشیات کا آغاز و ارتقاء

معاشی فکر کی ابتدا قدیم تہذیبوں سے ہوتی ہے۔ یونان میں زینوفون نے گھریلو انتظام پر لکھا اور ارسطو نے دولت کے قدرتی اور غیر قدرتی حصول میں فرق کرتے ہوئے سود اور اجارہ داری پر تنقید کی۔ رومی دور میں زراعت اور قانون پر خاص توجہ رہی۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے اسکالسٹک مفکرین، خصوصاً تھامس ایکوائناس، نے عادل قیمت اور سود کی ممانعت جیسے موضوعات پر بحث کی، جبکہ اسی دور میں مسلم مفکرین نے معاشی فکر کو کہیں زیادہ وسعت دی؛ ابنِ خلدون نے اپنے مقدمے میں تقسیمِ محنت، قیمتوں، ٹیکسوں اور تہذیب کے عروج و زوال کے معاشی اسباب پر وہ بحثیں کیں جنہیں آج بھی معاشیات کی تاریخ میں سنگِ میل مانا جاتا ہے۔ سولہویں سے اٹھارویں صدی تک یورپ میں مرکینٹلزم کا دور رہا جس میں دولت کو سونے چاندی کے ذخیرے سے ناپا گیا اور برآمدات کے فروغ کو ریاستی پالیسی بنایا گیا۔

اٹھارویں صدی میں فرانس کے فزیوکریٹ مکتب نے، جس کے سرخیل کیزنے تھے، زمین کو دولت کا اصل سرچشمہ قرار دیا اور قدرتی نظام کا نظریہ پیش کیا۔ 1776ء میں ایڈم سمتھ کی کتاب دولتِ اقوام کی اشاعت کو جدید معاشیات کی باقاعدہ ابتدا مانا جاتا ہے؛ اس نے تقسیمِ محنت، آزاد منڈی اور پوشیدہ ہاتھ کے تصورات دیے اور کلاسیکی مکتب کی بنیاد رکھی جسے ریکارڈو، مالتھس اور جان اسٹورٹ مل نے آگے بڑھایا۔ انیسویں صدی میں کارل مارکس نے سرمایہ داری پر تنقید کر کے اشتراکی فکر کو منظم شکل دی، اور 1871ء کے لگ بھگ جیونز، مینگر اور والراس نے حاشیائی افادے کے نظریے سے نوکلاسیکی انقلاب برپا کیا جسے مارشل نے 1890ء میں اپنی کتاب اصولِ معاشیات میں منظم نظام کی شکل دی۔ 1936ء میں کینز کی عمومی نظریہ نے کساد بازاری کے حل کے لیے ریاستی مداخلت اور مجموعی طلب کے تصورات دیے اور بڑی معاشیات کو الگ شاخ بنا دیا۔ بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں فریڈمین کی مدرت پسندی، نئے ادارہ جاتی نظریات اور رویہ جاتی معاشیات آئیں، اور اسی صدی میں اسلامی معاشیات بھی ایک مستقل علمی شعبے کی صورت میں ابھری جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں سود سے پاک بینکاری، زکاۃ اور وقف کے نظاموں پر منظم تحقیق شروع ہوئی۔

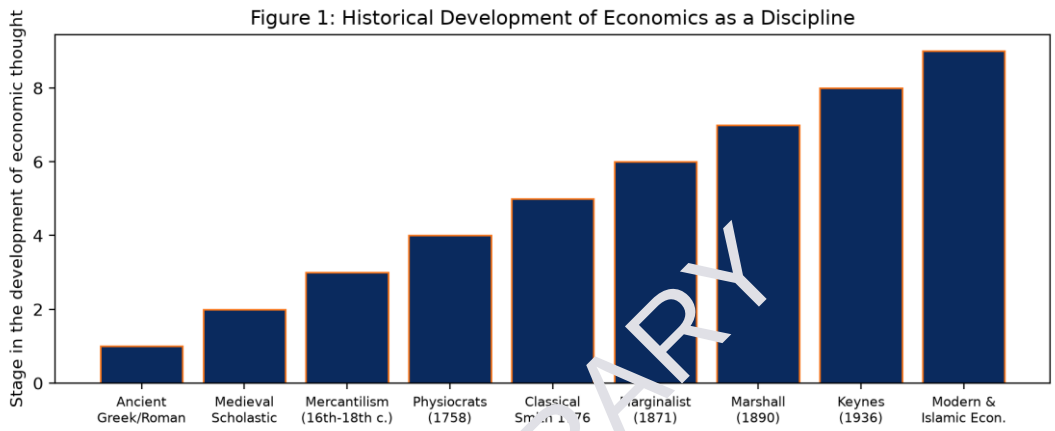

خاکہ 1: معاشی فکر کے ارتقائی مراحل

معاشیات کا نفسِ مضمون

کسی علم کے نفسِ مضمون سے مراد وہ موضوعات ہیں جن سے وہ علم باقاعدہ بحث کرتا ہے۔ معاشیات کا مرکزی موضوع انسان کا وہ رویہ ہے جو اس کی لامحدود خواہشات اور محدود وسائل کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے قلت، انتخاب اور موقع لاگت اس کے بنیادی تصورات ہیں۔ وسعت کے اعتبار سے اس کا دائرہ چار بڑے شعبوں پر مشتمل ہے: پیداوار، یعنی زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم جیسے عوامل کو ملا کر اشیاء و خدمات تیار کرنا؛ تبادلہ، یعنی خرید و فروخت، منڈی، قیمت کا تعین اور کرنسی کا نظام؛ تقسیم، یعنی پیدا شدہ دولت کا عواملِ پیداوار میں اجرت، کرایہ، سود یا منافع اور دیگر حصوں کی صورت میں بانٹا جانا؛ اور صرف، یعنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اشیاء کا استعمال۔ طرزِ بحث کے اعتبار سے اسے چھوٹی معاشیات میں تقسیم کیا جاتا ہے جو فرد، گھرانے اور فرم کے فیصلوں کا مطالعہ کرتی ہے، اور بڑی معاشیات میں جو مجموعی آمدنی، روزگار، مہنگائی اور تجارتی توازن جیسے مجموعی مظاہر دیکھتی ہے۔ اسلامی معاشیات اسی نفسِ مضمون کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں دو اضافے کرتی ہے: ایک یہ کہ ہر معاشی سرگرمی کو حلال و حرام کے پیمانے سے پرکھا جاتا ہے، اور دوسرا یہ کہ تقسیمِ دولت میں عدل اور ضرورت مندوں کے حق کو نظام کا لازمی جزو بنایا جاتا ہے، چنانچہ زکاۃ، وراثت اور وقف جیسے ادارے اس کے نفسِ مضمون کا حصہ بن جاتے ہیں۔

اسلام سے قبل طائف کی معاشی سرگرمیاں

طائف مکہ مکرمہ کے جنوب مشرق میں واقع ایک بلند اور نسبتاً سرد پہاڑی شہر تھا جسے بنو ثقیف آباد کیے ہوئے تھے۔ مکہ کے برعکس یہاں پانی اور زرخیز زمین دستیاب تھی، اس لیے طائف کی معیشت کی بنیاد زراعت اور باغبانی تھی۔ یہاں انگور کے وسیع باغات تھے جن سے کشمش تیار ہوتی اور ایک مشروب بھی کشید کیا جاتا تھا، انار اور دیگر پھل پیدا ہوتے تھے اور سبزیاں اگائی جاتی تھیں۔ مکہ کے سرداروں اور تاجروں کے یہاں باغات اور گرمیوں کی رہائش گاہیں تھیں، کیونکہ موسم کی خوشگواری کی بنا پر طائف اہلِ مکہ کے لیے تفریحی مقام کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ بارش کے پانی کو محفوظ کرنے کے لیے بند اور کنویں کھودے جاتے تھے اور باغات کی دیکھ بھال غلاموں اور مزدوروں کے ذریعے ہوتی تھی۔ زمین کی ملکیت قبائلی سرداروں اور مال دار افراد کے پاس مرکوز تھی اور کاشت کاری میں بٹائی جیسی صورتوں کا رواج بھی پایا جاتا تھا، جن میں سے بعض صورتوں کو بعد میں اسلام نے ممنوع یا درست صورتوں سے بدل دیا۔

زراعت کے ساتھ طائف تجارت اور صنعت کا بھی مرکز تھا۔ یہاں چمڑے کی دباغت اور مصنوعات خاص طور پر مشہور تھیں اور طائفی چمڑا جزیرے کے بازاروں میں فروخت ہوتا تھا۔ طائف یمن اور مکہ کے درمیان تجارتی راستے پر واقع تھا، اس لیے قافلے یہاں قیام کرتے اور مقامی پیداوار قافلوں کے ذریعے مکہ، یمن اور شام کی منڈیوں تک پہنچتی تھی۔ قریب ہی عکاظ کا مشہور سالانہ میلہ لگتا تھا جس میں تجارت کے ساتھ ادبی محفلیں بھی ہوتیں اور دور دراز کے قبائل شریک ہوتے، یوں طائف پورے خطے کے تبادلے کا مرکز بن جاتا تھا۔ معاشی زندگی کے دیگر پہلوؤں میں سود پر قرض کا رواج، غلاموں کی خرید و فروخت اور اجرت پر مزدوری شامل تھی۔ مختصر یہ کہ طائف اس دور کے عرب کی سب سے منظم زرعی معیشتوں میں سے تھا، لیکن اس میں بھی دولت کا ارتکاز، سودی لین دین اور کمزور طبقوں کا استحصال جیسے وہی مسائل موجود تھے جن کی اصلاح اسلام کے معاشی نظام نے پیش کی۔

جدول 1: قبل از اسلام طائف کی معاشی سرگرمیوں کا خلاصہ

شعبہ	اہم سرگرمیاں	معاشی اہمیت

خوراک، برآمد اور اہلِ مکہ کی طلب کی تکمیل	انگور، انار، پھل، سبزیاں، کشمش	زراعت و باغبانی
پہاڑی علاقے میں زراعت کا تسلسل	کنویں، بارش کے پانی کے بند	آب پاشی
جزیرہ نما عرب میں طائفی چمڑے کی مانگ	چمڑے کی دباغت و مصنوعات	صنعت
زرعی پیداوار کا تبادلہ اور آمدنی	یمن، مکہ و شام کے قافلے، میلہ عکاظ	تجارت
سرمائے کی فراہمی مگر استحصالی پہلو بھی	قرض و سود، اجرت، غلاموں کی تجارت	مالی معاملات

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ معاشیات قلت کے ماحول میں انسانی انتخاب اور فلاح کا علم ہے جو قدیم یونانی فکر سے لے کر کلاسیکی، نوکلاسیکی اور کینیزین دور سے گزرتا ہوا جدید شکل اختیار کر گیا، اور اس کا نفسِ مضمون پیداوار، تبادلہ، تقسیم اور صرف پر مشتمل ہے۔ اسلام سے قبل طائف کا مطالعہ اس لیے مفید ہے کہ یہ دکھاتا ہے کہ اس دور کا عرب محض صحرائی خانہ بدوشی تک محدود نہیں تھا؛ طائف جیسے شہر میں باقاعدہ زراعت، صنعت اور بین الاقوامی تجارت کا نظام موجود تھا، اگرچہ سود اور ارتکازِ دولت اس کے بڑے نقص تھے۔ اسی ماحول کو سامنے رکھ کر اگلے یونٹس میں بیان ہونے والے اسلامی معاشی اصولوں کی انقلابی حیثیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

سوال نمبر 2: اسلامی اور سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کی فکری بنیادوں کا تقابل (20 نمبر)

سوال نمبر 2: اسلامی اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی فکری بنیادوں کا تقابل کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

ہر معاشی نظام محض تکنیکی اصولوں کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے انسان، کائنات اور دولت کے بارے میں ایک مکمل فکری بنیاد کارفرما ہوتی ہے۔ سرمایہ داری اور اسلامی نظامِ معیشت کے درمیان عملی فرق، مثلاً سود کے جواز یا حرمت کا مسئلہ، دراصل انہی فکری بنیادوں کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ اس جواب میں پہلے دونوں نظاموں کی فکری بنیادیں الگ الگ بیان کی جائیں گی، پھر ان کا منظم تقابل جدول اور شرح کے ذریعے پیش کیا جائے گا، تاکہ یہ واضح ہو کہ سطحی مشابہتوں کے باوجود دونوں کے مقاصد اور انسان کا تصور بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یہ تقابل خالص علمی مطالعے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، کسی فرد، ملک یا ادارے پر اس کے اطلاق کا فیصلہ اس کے اپنے قانونی و علمی اداروں کا کام ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی فکری بنیادیں

سرمایہ داری کی فکری بنیاد سیکولر مادیت ہے، یعنی معاشی زندگی کو مذہبی ہدایت سے الگ رکھ کر صرف دنیوی افادے کے پیمانے پر کھا جاتا ہے۔ اس میں انسان کو معاشی انسان فرض کیا جاتا ہے جو ہر فیصلے میں اپنا مادی فائدہ زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ملکیت کا تصور مطلق اور انفرادی ہے: فرد اپنی دولت کا مکمل مالک ہے اور اس کے استعمال پر اصولی پابندی نہیں، سوائے اس قانونی حد کے جو دوسروں کے اسی حق سے ٹکراتی ہو۔ معاشی آزادی اس نظام کا مرکزی اصول ہے جسے عدم مداخلت کہا جاتا ہے؛ قیمتوں کا تعین طلب و رسد سے ہوتا ہے اور ریاست کا کردار امن و قانون اور معاہدوں کے نفاذ تک محدود رکھا جاتا ہے۔ مقابلہ اس نظام کی محرک قوت ہے اور منافع اس کی کامیابی کا پیمانہ۔ سود کو سرمائے کے استعمال کی جائز قیمت سمجھا جاتا ہے اور اسی پر بینکاری کا پورا نظام قائم ہے۔ دولت کی تقسیم کے بارے میں اس نظام کا اصولی مؤقف یہ ہے کہ بازار خود حصے متعین کر دے، جس کے نتیجے میں ارتکازِ دولت کو ایک فطری امر سمجھ کر قبول کیا جاتا ہے اور مصلحتِ عامہ کے اقدامات کو نظام کی خارجی اصلاح سمجھا جاتا ہے، اس کا بنیادی جزو نہیں۔

اسلامی نظامِ معیشت کی فکری بنیادیں

اسلامی نظام کی بنیاد توحید اور استخلاف ہے۔ تمام دولت و وسائل کی اصل ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور انسان اس مال میں خلیفہ اور امین ہے، اس لیے اس کی ملکیت مطلق نہیں بلکہ امانت کے تصور سے بندھی ہوئی ہے۔ اسی بنیاد سے معاشی آزادی مقید صورت اختیار کرتی ہے: کمائی، خرچ اور سرمایہ کاری کی آزادی ہے مگر حلال و حرام کی حدود کے اندر؛ سود، جوا، ذخیرہ اندوزی اور فراڈ جیسی صورتیں اس لیے ممنوع ہیں کہ وہ ان میں خیانت اور دوسروں کے حق کی خلاف ورزی ہیں۔ انسان کا اسلامی تصور محض معاشی انسان نہیں بلکہ عبد اور خلیفہ ہے جس کا مقصد دنیوی فلاح کے ساتھ اخروی فلاح بھی ہے، اس لیے اخلاقی قدریں نظام کے اندر شامل ہیں، باہر سے عائد نہیں۔ تقسیم کے باب میں اسلام بنیادی اصول عدل کا ہے: زکاۃ کے ذریعے دولت کی لازمی گردش، وراثت کے ذریعے دولت کی منتقل تقسیم اور صدقات و وقف کے ذریعے رضاکارانہ توازن قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست محض تماشائی نہیں بلکہ حسبہ جیسے اداروں کے ذریعے بازار کی نگرانی اور مظلوم کی دادرسی اس کی ذمہ داری ہے، البتہ جائز نجی ملکیت اور تجارت کا تحفظ بھی اسی نظام کا حصہ ہے۔

جدول 2: دونوں نظاموں کی فکری بنیادوں کا تقابل

پہلو	سرمایہ دارانہ نظام	اسلامی نظام
فکری بنیاد	سیکولر مادیت؛ مذہب سے لاتعلقی	توحید و استخلاف؛ وحی کی ہدایت
ملکیت	مطلق انفرادی ملکیت	اصل ملکیت اللہ کی؛ انسان امین و خلیفہ
معاشی آزادی	اصولی طور پر غیر مقید آزادی	حلال و حرام کی حدود میں مقید آزادی
انسان کا تصور	معاشی انسان؛ مفاد کا پیروکار	عبد و خلیفہ؛ ذمہ دار و جواب دہ
سود	سرمائے کی جائز قیمت	ربا کی صورت میں ممنوع

زکاۃ، وراثت و وقف سے لازمی توازن	بازار کے رحم و کرم پر؛ ارتکاز قابلِ قبول	تقسیمِ دولت
نگرانی، عدل و فلاح کی ذمہ داری	کم سے کم مداخلت	ریاست کا کردار
دنیوی و اخروی فلاح اور عدل	مادی افزائش و زیادہ سے زیادہ منافع	مقصد

تقابل کی مزید شرح

اوپر کا جدول دکھاتا ہے کہ فرق عملی اصولوں سے پہلے تصورات کی سطح پر ہے۔ ملکیت ہی کو لے لیجیے: سرمایہ داری میں مالک کا حق استعمال تقریباً لامحدود ہے، اس لیے ثروت کا مظاہرہ اور فضول خرچی اخلاقی سوال نہیں بنتی؛ اسلام میں ملکیت تسلیم شدہ ہے لیکن مالک اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، اس لیے اسراف اور بخل دونوں مذموم ہیں اور مال میں ضرورت مند کا حق مقرر ہے۔ اسی طرح مقابلے کے تصور میں بھی نکتہ فرق ہے: سرمایہ داری مقابلے کو واحد محرک مانتی ہے، جس سے اجارہ داری اور کمزور کا استحصال جنم لیتا ہے، جبکہ اسلام منصفانہ مقابلے کی اجازت کے ساتھ تعاون، ایثار اور بھائی چارے کو بھی معاشی رویے کا حصہ بناتا ہے۔ سود کا مسئلہ انہی بنیادوں کی عملی شکل ہے: جہاں سرمائے کو محض کرائے پر دی جانے والی چیز سمجھا جائے وہاں سود فطری ہے، اور جہاں رقم کو پیداوار میں حقیقی خطرہ مول لیے بغیر بڑھانا ظلم سمجھا جائے وہاں سرمایہ کاری کی جائز صورتیں مضاربت و شرکت جیسی شراکتی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔

انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ بھی نوٹ کیا جائے کہ عصرِ حاضر کی سرمایہ داری اپنی خالص عدم مداخلت والی شکل میں کہیں باقی نہیں رہی؛ فلاحی ریاست، لیبر قوانین اور اجارہ داری مخالف قوانین اس میں بڑی اصلاحات لا چکے ہیں، اور بعض مسلمان ممالک میں بھی عملی نظام مخلوط صورت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود فکری بنیادوں کا فرق باقی رہتا ہے، کیونکہ اصلاحات سرمایہ داری میں فلاح کو خارجی اضافہ بناتی ہیں جبکہ اسلامی نظام میں فلاح و عدل اس کا مقصدِ اصلی ہیں۔ دوسری طرف اسلامی نظام نجی ملکیت، جائز منافع اور آزاد تجارت کو تسلیم کرتا ہے، اس لیے اسے اشتراکیت سے بھی ممتاز سمجھنا ضروری ہے؛ یہ انفرادی آزادی اور سماجی ذمہ داری کے درمیان اعتدال کا نظام ہے جسے اس کے مفکرین معتدل راہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

خلاصہ و نتیجہ

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں نظاموں کا اصل اختلاف سود یا زکاۃ جیسے کسی ایک عملی قاعدے سے شروع نہیں ہوتا بلکہ اس سوال سے شروع ہوتا ہے کہ دولت کا مالک کون ہے اور انسان کائنات میں جواب دہ ہے یا آزاد۔ سرمایہ داری مادی نظام، مطلق نجی ملکیت اور غیر مقید آزادی پر قائم ہے جبکہ اسلامی نظام توحید، امانت، مقید آزادی اور عدلی تقسیم پر قائم ہے۔ طالب علم کے لیے اس تقابل کا فائدہ یہ ہے کہ وہ جزوی مسائل کو ان کی بنیادوں سے جوڑ کر سمجھتا ہے اور کسی بھی جدید معاشی صورت کا اسلامی جائزہ لیتے وقت وہی اصول استعمال کر سکتا ہے جو اگلے ابواب میں بیع، شرکت اور اجارہ جیسے معاملات کی بنیاد ہیں۔

سوال نمبر 3: زکاۃ و عشر اور ان کی معاشی اہمیت (20 نمبر)

سوال نمبر 3: زکاۃ و عشر اور اس کی معاشی اہمیت پر نوٹ لکھیں۔ (20 نمبر)

تعارف

زکاۃ اور عشر اسلامی معاشی نظام کے وہ دو لازمی مالی ادارے ہیں جن کے ذریعے دولت کی گردش اور ضرورت مندوں تک وسائل کی منتقلی باقاعدہ نظام کی شکل اختیار کرتی ہے۔ زکاۃ نماز کے بعد سب سے زیادہ تاکید یافتہ عبادات میں سے ہے اور اس کا دائرہ نقدی، سونا چاندی، مالِ تجارت اور مویشیوں تک پھیلا ہوا ہے، جبکہ عشر کا تعلق زرعی پیداوار سے ہے۔ سوال میں دونوں کا تعارف اور پھر ان کی معاشی اہمیت پوچھی گئی ہے، اس لیے پہلے دونوں کا مفہوم، نصاب و شرح اور مصارف بیان کیے جائیں گے، عشر اور زکاۃ کا باہمی فرق واضح کیا جائے گا اور آخر میں ان کے معاشی اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ یاد رہے کہ یہاں بیان خالص علمی و درسی ہے؛ کسی فرد کی زکاۃ کی عملی تطبیق میں اہلِ علم کی رہنمائی ہی معتبر ہے۔

زکاۃ کا مفہوم، نصاب اور مصارف

زکاۃ کے لغوی معنی پاکیزگی اور بڑھوتری کے ہیں، اور اصطلاح میں یہ مال کا وہ مقررہ حصہ ہے جو نصاب کے مالک مسلمان پر سال گزرنے کے بعد شرعی مصارف میں دینا فرض ہوتا ہے۔ زکاۃ کے بنیادی اصول فقہ میں طے شدہ ہیں: مال کا نصاب کو پہنچنا، اس کا نامی یعنی بڑھنے والا یا بڑھنے کی صلاحیت رکھنے والا ہونا، حوائجِ اصلیہ سے زائد ہونا اور اس پر قمری سال کا گزرنا۔ نصاب کی مشہور مقداریں یہ ہیں: سونا ساڑھے سات تولے، چاندی ساڑھے باون تولے، اور نقدی و مالِ تجارت کا نصاب انہی کے برابر قیمت سے متعین ہوتا ہے؛ ان سب پر شرح ڈھائی فیصد ہے۔ مویشیوں، یعنی اونٹ، گائے اور بکریوں، کے نصاب و شرح جدولوں میں مفصل مذکور ہیں اور ان میں سائمہ یعنی چرنے والے جانوروں کی قید بھی فقہاء نے بیان کی ہے۔ دریافت شدہ خزانے یعنی رکاز پر پانچواں حصہ مقرر ہے۔ زکاۃ کے مصارف قرآن مجید میں آٹھ بیان ہوئے ہیں: فقراء، مساکین، عاملینِ زکاۃ، مؤلفۃ القلوب، غلاموں کی آزادی، مقروض، فی سبیل اللہ اور مسافر۔ ان مصارف کی خصوصیت یہ ہے کہ زکاۃ حکومت کے عام خزانے کا خرچ نہیں بلکہ متعین ضرورت مند طبقات کا حق ہے۔

عشر کا مفہوم اور زکاۃ سے فرق

عشر کے معنی دسواں حصہ ہیں اور اصطلاح میں یہ زرعی زمین کی پیداوار پر عائد ہونے والا وہ مقررہ حصہ ہے جو فصل کی کٹائی پر لیا جاتا ہے۔ جو زمین قدرتی ذرائع یعنی بارش یا خود رواں پانی سے سیراب ہو اس میں دسواں حصہ ہے اور جو زمین محنت و خرچ سے، مثلاً کنویں، ٹیوب ویل یا خریدے ہوئے پانی سے سیراب ہو اس میں بیسواں حصہ یعنی نصف عشر ہے؛ یہ شرحیں حنفی و جمہور فقہاء کے ہاں معروف ہیں۔ عشر اور زکاۃ میں چند بنیادی فرق ہیں: زکاۃ میں سال گزرنا شرط ہے جبکہ عشر میں ہر فصل پر اس کا حق پیدا ہو جاتا ہے؛ زکاۃ میں نصاب سب کے نزدیک شرط ہے جبکہ عشر کے نصاب میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ کے نزدیک زمین کی پیداوار کم ہو یا زیادہ عشر واجب ہے البتہ ان کے صاحبین اور جمہور پانچ وسق کو نصاب قرار دیتے ہیں؛ زمین کے عشری یا خراجی ہونے کا فرق بھی اسی باب میں آتا ہے۔ مالک کے بالغ و عاقل ہونے کی قید بھی عشر میں زکاۃ سے مختلف بحث رکھتی ہے۔ ان فروق کے باوجود دونوں کا مقصد ایک ہی ہے: مال کے بڑھنے والے حصے میں سے معاشرے کے حق کو باقاعدہ وصول کرنا۔

جدول 3: زکاۃ و عشر کی شرحوں کا خلاصہ

مال / پیداوار	نصاب کی بنیاد	شرح
سونا	ساڑھے سات تولے	ڈھائی فیصد
چاندی	ساڑھے باون تولے	ڈھائی فیصد
نقدی و مالِ تجارت	سونے یا چاندی کے نصاب کے برابر قیمت	ڈھائی فیصد
بارانی زرعی پیداوار	عشر؛ نصاب میں فقہی اختلاف	دس فیصد
مصنوعی آب پاشی کی پیداوار	نصف عشر	پانچ فیصد
رکاز (دفینہ)	—	بیس فیصد (خمس)

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

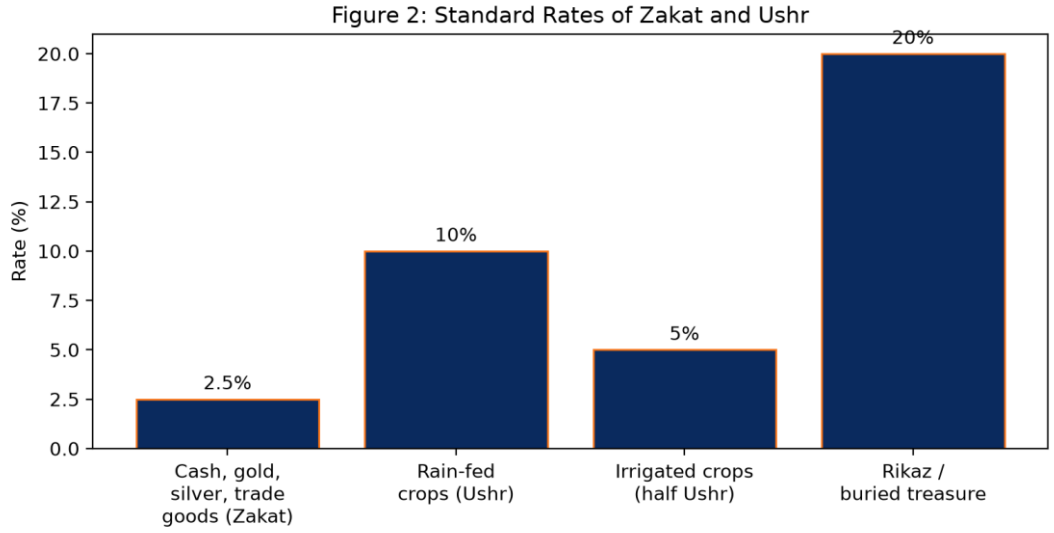

خاکہ 2: زکاۃ و عشر کی معیاری شرحیں

زکاۃ و عشر کی معاشی اہمیت

زکاۃ کی معاشی اہمیت کا پہلا پہلو دولت کی گردش ہے۔ جو دولت جمع ہو کر رک جائے وہ سالانہ ڈھائی فیصد کی شرح سے بتدریج کم ہوتی ہے، اس لیے مالک کے لیے معاشی ترغیب یہ بنتی ہے کہ وہ مال کو ذخیرہ کرنے کے بجائے تجارت و سرمایہ کاری میں لگائے تاکہ منافع زکاۃ سے زیادہ ہو۔ یوں زکاۃ دولت کے ارتکاز کے خلاف ایک اندرونی نظام کی طرح کام کرتی ہے، جو جدید معاشیات کے اس مسئلے کا حل پیش کرتی ہے جس میں دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر مجموعی طلب کو کمزور کر دیتی ہے۔ دوسرا پہلو غربت و محرومی میں کمی ہے: زکاۃ کے آٹھ مصارف براہ راست ان طبقات کو سہارا دیتے ہیں جن کی قوتِ خرید سب سے کم ہوتی ہے، اور جب ضرورت مند کی قوتِ خرید بڑھتی ہے تو بازار میں طلب بڑھتی ہے، پیداوار کو تحریک ملتی ہے اور روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ تیسرا پہلو سماجی تحفظ ہے: مقروض، مسافر اور اچانک آفت کا شکار شخص زکاۃ سے سہارا پا کر معاشی نظام سے باہر نہیں پھینکتا، جو جدید سوشل سیکیورٹی کے تصور سے مشابہ مگر اس سے قدیم اور عبادتی بنیاد رکھنے والا انتظام ہے۔

عشر کی معاشی اہمیت زرعی شعبے میں ظاہر ہوتی ہے۔ فصل کی پیداوار پر عائد ہونے کی وجہ سے یہ آمدنی کے بجائے پیداوار کی نوعیت کا محصول ہے جس میں کاشت کار پر نقصان کی صورت میں بھی وہی بوجھ نہیں پڑتا جو مقررہ لگان کی صورت میں پڑتا ہے، کیونکہ شرح پیداوار کے تناسب سے ہے۔ اس سے دیہی علاقوں میں دولت کی مقامی سطح پر تقسیم ہوتی ہے اور گاؤں کے فقراء کا حق اسی زمین کی پیداوار سے ادا ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر زکاۃ و عشر ملا کر ایک ایسا مالی نظام بناتے ہیں جو عبادت بھی ہے اور معاشی پالیسی بھی، بشرطیکہ اس کی وصولی و تقسیم منظم اور شفاف ہو۔ مفکرین اسی لیے کہتے ہیں کہ اگر زکاۃ کی مکمل ادائیگی معاشرے میں عام ہو جائے تو غربت کی شدید صورتوں میں نمایاں کمی آ سکتی ہے، البتہ یہ دعویٰ اندازوں پر مبنی ہے اور اس کا انحصار عملی نظام پر ہے۔ آخری نکتہ یہ کہ زکاۃ و عشر مالک کے دل میں مال کی محبت کے بجائے ذمہ داری کا احساس پیدا کرتے ہیں، اور یہ اخلاقی تربیت ہی وہ سرمایہ ہے جس پر باقی معاشی فوائد قائم ہوتے ہیں۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ زکاۃ نصاب والے اموال پر ڈھائی فیصد کی شرح سے فرض ایک مالی عبادت ہے اور عشر زرعی پیداوار پر دس یا پانچ فیصد کی شرح سے عائد حق ہے۔ دونوں مل کر اسلامی نظام میں دولت کی گردش، غربت میں کمی، سماجی تحفظ اور زرعی شعبے کی منصفانہ آبیاری کا انتظام کرتے ہیں۔ فقہ المالیات کے طالب علم کے لیے ان کے فقہی اصول جتنا اہم ہے اتنا ہی ان کی معاشی حکمت کو سمجھنا ہے، کیونکہ یہی وہ ادارے ہیں جو اسلامی نظام کو محض نظری دعوے کے بجائے عملی شکل دیتے ہیں۔

سوال نمبر 4: بیع میں ایجاب و قبول کی شرائط (20 نمبر)

سوال نمبر 4: بیع میں ایجاب و قبول کی شرائط کے حوالے سے جامع نوٹ لکھیں۔ (20 نمبر)

تعارف

بیع فقہ المالیات کا مرکزی عقد ہے، کیونکہ روزمرہ کی تمام خرید و فروخت اسی کے اصولوں پر پرکھی جاتی ہے۔ کسی بھی عقد کی صحت کا دارومدار اس کے ایجاب و قبول کے درست ہونے پر ہے؛ اگر پیشکش اور اس کی منظوری میں نقص ہو تو پورا سودا مشکوک یا باطل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فقہاء نے ایجاب و قبول کی شرائط کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس جواب میں پہلے عقدِ بیع، ایجاب اور قبول کے مفاہیم واضح کیے جائیں گے، پھر ان کی شرائط کو منظم انداز میں بیان کیا جائے گا، جدید ذرائع یعنی تحریر، فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے ہونے والے ایجاب و قبول کا حکم ذکر ہو گا اور آخر میں شرائط کی خلاف ورزی کے نتائج پر مختصر بحث کی جائے گی۔

عقدِ بیع، ایجاب اور قبول کا مفہوم

بیع کے لغوی معنی خرید و فروخت کے ہیں اور اصطلاح میں یہ مال کا مال سے باہمی رضامندی کے ساتھ تبادلہ ہے جس سے مبیع یعنی بیچی جانے والی چیز کی ملکیت خریدار کو اور ثمن یعنی قیمت کی ملکیت بائع کو منتقل ہو جاتی ہے۔ فقہاء کے نزدیک بیع کا رکن ایجاب و قبول ہے؛ باقی امور، مثلاً مبیع و ثمن کی شرائط، اسی رکن کی تکمیل سے متعلق ہیں۔ ایجاب اس

پہلی پیشکش کو کہتے ہیں جو دونوں فریقوں میں سے کسی کی طرف سے سودے کے لیے کی جائے، خواہ وہ بائع کی طرف سے ہو یا خریدار کی طرف سے، اور قبول اس دوسرے قول یا عمل کو کہتے ہیں جو اس پیشکش کو تسلیم کرے۔ فقہِ حنفی میں ایجاب و قبول کے الفاظ ماضی کے صیغے میں ہوں یا حال کے، دونوں صورتوں میں عقد منعقد ہو جاتا ہے، کیونکہ عرف میں پیشکش اور منظوری کا مفہوم انہی صیغوں سے سمجھا جاتا ہے۔ تحریر اور اشارہ بھی مخصوص صورتوں میں قول کے قائم مقام ہوتے ہیں: گونگے کا معروف اشارہ اس کا بیان ہے، اور غائب شخص کے لیے خط اور پیغام کے ذریعے بھی عقد کی صورت میں فقہی کتب میں مذکور ہیں، جن کی جدید شکلیں ای میل اور آن لائن آرڈر ہیں۔

ایجاب و قبول کی بنیادی شرائط

پہلی شرط مجلسِ عقد کی وحدت ہے، یعنی ایجاب و قبول ایک ہی مجلس میں ہوں۔ مجلس سے مراد وہ نشست اور وہ زمانی رابطہ ہے جس میں ایک فریق کی پیشکش دوسرے تک پہنچے اور وہ اسی سلسلے میں جواب دے؛ درمیان میں سودے سے غیر متعلقہ طویل اشتغال یا مجلس کا برخاست ہو جانا اس وحدت کو ختم کر دیتا ہے۔ دوسری شرط ایجاب و قبول کی مطابقت ہے: قبول بعینہٖ اسی چیز اور اسی قیمت پر ہو جس کی پیشکش ہوئی ہو؛ اگر خریدار نے کم قیمت یا مختلف چیز کی منظوری دی تو یہ قبول نہیں بلکہ نیا ایجاب شمار ہو گا اور اصل پیشکش کرنے والے کی منظوری درکار ہو گی۔ تیسری شرط یہ ہے کہ قبول کے وقت ایجاب قائم ہو؛ اگر پیشکش کرنے والا قبول سے پہلے رجوع کر لے، فوت ہو جائے یا اس کی اہلیت ختم ہو جائے تو بعد کا قبول بے اثر ہو گا۔ چوتھی شرط یہ کہ دونوں فریق اہلیت رکھتے ہوں، یعنی عاقل ہوں اور تمیز کی عمر یا بلوغ و رشد کی شرعی شرائط کے مطابق تصرف کے اہل ہوں؛ نابالغ ممیز کی بیع میں ولی کی اجازت کی بحث اسی شرط کے تحت آتی ہے۔ پانچویں شرط یہ کہ ایجاب و قبول کا مفہوم واضح ہو اور ان میں کوئی ایسی جہالت یا شرط نہ ہو جو عقد کو فاسد کرے۔

ان کے علاوہ چند ضمنی شرائط بھی کتب میں بیان ہوتی ہیں۔ خریدار کو مجلس کے برخاست ہونے تک جس حد تک خیارِ مجلس کا حق حاصل ہے اس میں فقہاء کا اختلاف ہے؛ شافعیہ و حنابلہ اس کے قائل ہیں جبکہ حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک بات طے ہونے کے بعد محض مجلس میں موجود رہنا فسخ کا حق نہیں دیتا، البتہ خیارِ شرط الگ سے طے کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ قبول، ایجاب کے بعد سکوت کی اس مدت میں نہ ہو جس سے مجلس ختم سمجھی جائے، اور یہ کہ پیشکش کسی معلق شرط پر موقوف نہ ہو جو عقد کی فوری نوعیت کے

منافی ہو۔ بائع اور مشتری کا ایک ہی شخص میں جمع ہونا بھی درست نہیں، یعنی کوئی اپنے سے خود خرید و فروخت کا عقد نہیں کر سکتا، البتہ وکالت کی صورتوں میں اس کی خاص صورتیں فقہاء نے الگ بیان کی ہیں۔ یہ تفصیلات دکھاتی ہیں کہ شرائط کا مقصد سادہ ہے: رضامندی حقیقی، واضح اور ایک ہی معاملے پر متفق ہو۔

جدول 4: ایجاب و قبول کی شرائط کا خلاصہ

شرط	مطلب	خلاف ورزی کا اثر
مجلس کی وحدت	پیشکش و منظوری ایک ہی مجلس و رابطے میں	مجلس برخاست ہونے کے بعد منظوری بے اثر
مطابقت	قبول اسی مبیع و ثمن پر جو پیش ہوا	مختلف منظوری نیا ایجاب شمار ہو گی
ایجاب کا قائم رہنا	رجوع، وفات یا اہلیت ختم ہونے سے پہلے ہوں	قبول واقع نہیں ہوتا
اہلیتِ فریقین	عقل اور تصرف کی شرعی اہلیت	عقد موقوف، فاسد یا باطل ہو سکتا ہے
وضاحت	صیغے سے پیشکش و منظوری واضح ہو	جہالت کی صورت میں عقد غیر درست

جدید ذرائع سے ایجاب و قبول

عصرِ حاضر میں زیادہ تر خرید و فروخت تحریر، فون اور انٹرنیٹ سے ہوتی ہے، اس لیے ان صورتوں کا حکم سمجھنا ضروری ہے۔ فقہاء کے اصولوں کی روشنی میں ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو میں مجلسِ عقد کی وحدت حکمی طور پر موجود سمجھی جاتی ہے، کیونکہ دونوں فریق بیک وقت ایک دوسرے کی بات سن کر جواب دے رہے ہوتے ہیں؛ رابطہ منقطع ہو جائے تو مجلس ختم ہو جاتی ہے۔ خط، ای میل اور پیغام کی صورت میں ایجاب اس وقت مؤثر ہوتا ہے جب وہ دوسرے فریق تک پہنچے، اور قبول کا وقت و مجلس اسی مناسبت سے پرکھا جاتا ہے۔ آن لائن خریداری میں ویب سائٹ پر قیمت کے ساتھ پیش کی گئی چیز کو عام طور پر دعوتِ معاملہ یا پیشکش کی نوعیت سے دیکھا جاتا ہے اور خریدار کا آرڈر کرنا اور پھر فروخت کنندہ کی تصدیق مل کر ایجاب و قبول کی تکمیل کرتی ہے؛ جس دقیق صورت پر فقہی آراء مختلف ہو سکتی ہیں، تاہم بنیادی اصول یہی ہے کہ رضامندی واضح ہو اور بعد میں ثمن و

مبیع میں کوئی جہالت نہ رہے۔ وینڈنگ مشین جیسی خودکار صورتوں میں عمل کو قول کے قائم مقام ماننے کی بحث بھی اسی باب میں آتی ہے۔ عملی مسائل میں تطبیق کے لیے مستند اہلِ علم کی رہنمائی ہی درست راستہ ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بیع کا رکن ایجاب و قبول ہے اور اس کی درستگی کے لیے مجلس کی وحدت، دونوں کا مطابق ہونا، ایجاب کا قائم رہنا، فریقین کی اہلیت اور صیغے کی وضاحت بنیادی شرائط ہیں۔ ان شرائط کی حفاظت سے سودے میں رضامندی حقیقی رہتی ہے، تنازعات کم ہوتے ہیں اور ملکیت کی منتقلی شرعاً معتبر ہوتی ہے۔ جدید ذرائع نے مجلس کی شکلیں بدل دی ہیں مگر اصول نہیں بدلے: جہاں پیشکش و منظوری واضح اور متصل ہوں وہاں عقد قائم ہوتا ہے، جہاں یہ رابطہ ٹوٹ جائے یا مطابقت نہ رہے وہاں نیا معاملہ درکار ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر آگے چل کر خیار، شرکت اور اجارہ جیسے ابواب کھڑے ہیں۔

سوال نمبر 5: وراثت اور اس کی معاشی اہمیت (20 نمبر)

سوال نمبر 5: وراثت اور اس کی معاشی اہمیت پر بحث کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

وراثت کا مسئلہ ہر معاشرے میں دولت کی بین النسلی منتقلی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جس نظام میں مرنے والے کی جائیداد صرف ایک فرد کو مل جائے وہاں دولت چند خاندانوں میں نسل در نسل مرتکز ہوتی رہتی ہے، اور جہاں تقسیم وسیع بنیاد پر ہو وہاں دولت گردش میں آتی ہے۔ اسلام نے وراثت کو محض عرف یا خاندانی روایت پر نہیں چھوڑا بلکہ متعین حصوں کے ساتھ ایک مکمل قانونی نظام دیا جسے علم الفرائض کہا جاتا ہے۔ اس جواب میں پہلے اسلامی نظامِ وراثت کی خصوصیات اور تقسیم کا عملی طریقہ بیان ہو گا، پھر اس

کی معاشی اہمیت کے پہلوؤں پر تفصیلی بحث ہو گی، تاکہ واضح ہو کہ یہ فقہی باب درحقیقت اسلامی معیشت کے تقسیمی عدل کی سب سے عملی صورت ہے۔ یہ بیان علمی وصف رکھتا ہے؛ کسی متنازع جائیداد کا فیصلہ عدالتوں اور اہلِ علم کا کام ہے۔

اسلامی نظامِ وراثت کی خصوصیات

اس نظام کی پہلی خصوصیت جبریت ہے: مرنے والے کی وفات کے ساتھ ہی اس کا ترکہ شرعی حصوں کے مطابق وارثوں کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا ہے، اور میت کی مرضی بھی وصیت کی صورت میں صرف ایک تہائی تک محدود ہے، اس سے زیادہ وصیت وارثوں کی اجازت کے بغیر نافذ نہیں ہوتی۔ دوسری خصوصیت حصوں کا پہلے سے متعین ہونا ہے: قرآنِ مجید میں بیوی، شوہر، ماں، باپ، بیٹیوں اور بہنوں سمیت متعدد رشتوں کے حصے، نصف، چوتھائی، آٹھواں، دو تہائی، ایک تہائی اور چھٹا حصہ، واضح طور پر مقرر ہیں، جس سے تنازعے کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ تیسری خصوصیت عورت کا مستقل حق ہے: بیٹی، ماں، بیوی اور بہن سب اپنے مقررہ حصے کی مالک ہیں، جو اس دور کے عرب عرف کے بالکل برعکس تھا جس میں عورت اور کمزور رشتہ دار محروم رہتے تھے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وراثت کے اسباب نسب، نکاح اور مخصوص حالات میں ولاء ہیں اور موانع، مثلاً قاتل کا مقتول کی وراثت سے محروم ہونا، بھی قانوناً بیان ہیں۔ تقسیم سے پہلے ترکے سے بالترتیب تجہیز و تکفین کے اخراجات، قرضوں کی ادائیگی اور جائز وصیت کی تکمیل کی جاتی ہے، اس کے بعد باقی ماندہ وارثوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

جدول 5: چند اہم وارثوں کے مقررہ حصے (عمومی صورتوں میں)

وارث	حصہ	عمومی شرط
شوہر	نصف یا چوتھائی	نصف جب میت کی اولاد نہ ہو، ورنہ چوتھائی
بیوی	چوتھائی یا آٹھواں	چوتھائی جب میت کی اولاد نہ ہو، ورنہ آٹھواں
بیٹی (اکیلی)	نصف	بیٹا موجود نہ ہو

بیٹا موجود نہ ہو	دو تہائی	دو یا زائد بیٹیاں
اولاد یا متعدد بہن بھائی ہوں تو چھٹا	ایک تہائی یا چھٹا	ماں
اولاد کی موجودگی میں	چھٹا (اور بعض صورتوں میں بقیہ بھی)	باپ

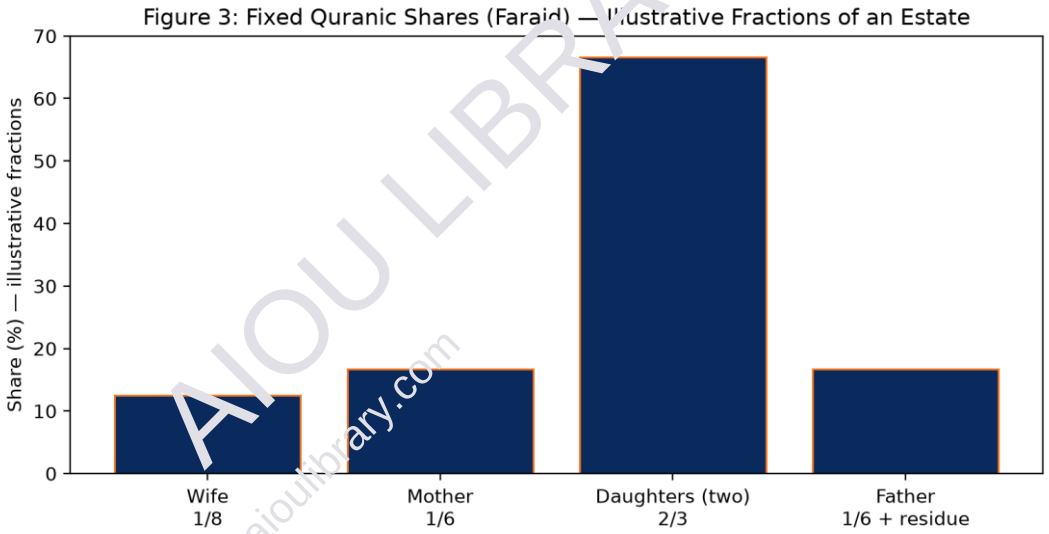

خاکہ 3: مقررہ قرآنی حصوں (فرائض) کی توضیحی جھلک

وراثت کی معاشی اہمیت

وراثت کی سب سے بڑی معاشی اہمیت دولت کے ارتکاز کی روک تھام ہے۔ چونکہ ترکہ ایک وارث کے بجائے بیوہ، والدین، اولاد اور بعض صورتوں میں بہن بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں میں تقسیم ہوتا ہے، اس لیے بڑی جائیدادیں ہر نسل میں از سر نو بٹ جاتی ہیں اور کوئی خاندان نسل در نسل معاشی اجارہ داری قائم نہیں رکھ پاتا۔ اس کے برعکس جن نظاموں میں بڑا بیٹا سب کچھ کا وارث بنتا تھا وہاں جاگیریں برقرار رہ کر معاشرتی طبقات کو جامد کر دیتی تھیں۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ تقسیم سے چھوٹے سرمایے بکثرت وجود میں آتے ہیں: ہر وارث کو ملنے والا حصہ اس کے لیے چھوٹی تجارت، تعلیم، مکان یا زرعی زمین کی خرید کا ذریعہ بن سکتا ہے، یوں معیشت میں نئے شرکا شامل ہوتے ہیں اور مسابقت بڑھتی ہے۔ تیسرا پہلو خواتین کی معاشی خودمختاری ہے: ماں، بیوی، بیٹی اور بہن کو ملنے والا اپنا حصہ انہیں مالی لحاظ سے کسی کا محتاج رہنے کے بجائے مالک بناتا ہے، جس کے

اثرات خاندانی فلاح اور بچوں کی تعلیم و صحت پر پڑتے ہیں۔ چوتھا پہلو سماجی تحفظ ہے: بیوہ اور یتیم بچوں کا حصہ قانوناً محفوظ ہونے سے وہ وفات کے صدمے کے ساتھ معاشی تباہی سے بھی بچ جاتے ہیں۔

مزید یہ کہ وراثت معاشی سرگرمی کو تحریک دیتی ہے۔ جائیداد کی بروقت اور واضح تقسیم سے زمین و مکانات کے استعمال میں آنے کی راہ کھلتی ہے، جبکہ غیر منقسم مشترکہ جائیداد تعمیر و ترقی سے رکی رہتی ہے، اس لیے شریعت میں تقسیم کی ترغیب اور تنازع کے فوری حل کو پسند کیا گیا ہے۔ قرض کی ادائیگی کو تقسیم پر مقدم رکھنا مالی نظام میں اعتماد پیدا کرتا ہے، کیونکہ قرض خواہ کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا حق موت سے ختم نہیں ہوتا۔ وصیت کی ایک تہائی حد بھی معاشی لحاظ سے بامعنی ہے: اس سے میت صدقہ جاریہ اور غیر وارث ضرورت مندوں کے لیے حصہ نکال سکتا ہے مگر خاندان کے مقررہ حقوق کو ختم نہیں کر سکتا، یوں انفرادی اختیار اور خاندانی حق کے درمیان توازن قائم رہتا ہے۔ البتہ یہ فوائد اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب تقسیم عملاً ہو؛ اگر بیٹیوں اور بیوہ کو حصہ دینے سے گریز کیا جائے تو نظام پر اعتراض نہیں، ارکے ناہل نفاذ پر اعتراض بنتا ہے، اور جدید دور میں جائیداد کے اندراج اور خواتین کے حق کی قانونی حفاظت اسی لیے اہم ہے۔

ایک اور پہلو خاندانی اداروں کی مضبوطی ہے۔ وراثت کی واضح تقسیم سے خاندانی کاروبار اور زرعی زمین کی ملکیت کا تعین بروقت ہو جاتا ہے، جس سے شراکت داروں کے حقوق واضح رہتے ہیں اور کاروبار اگلی نسل میں تنازعات کے بغیر منتقل ہو سکتا ہے؛ اس کے برعکس جہاں تقسیم مؤخر ہوتی رہے وہاں زمینیں غیر آباد اور کاروبار غیر فعال ہو جاتے ہیں اور عدالتی مقدمات خاندان کی دولت کا بڑا حصہ کھا جاتے ہیں۔ اسی لیے معاصر اقتصادی ماہرین بھی واضح اور فوری تقسیم ترکہ کو خاندانی دولت کے تحفظ کا ذریعہ مانتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ وراثت ہر جنس و عمر کے افراد کو پیداواری عمل میں کردار دیتی ہے: نوجوان وارث اپنا حصہ تعلیم و ہنر میں لگا سکتا ہے، بیوہ اپنا حصہ محفوظ آمدنی میں رکھ سکتی ہے اور بوڑھے والدین اپنے حصے سے باعزت زندگی گزار سکتے ہیں۔ یوں یہ نظام خاندان کے اندر ہی ایک چھوٹا سماجی تحفظ کا جال بن جاتا ہے جس پر ریاست کے فلاحی اخراجات کا بوجھ بھی کم ہوتا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی وراثت محض مذہبی رسم نہیں بلکہ دولت کی وسیع، متعین اور جبری تقسیم کا قانونی نظام ہے۔ اس کی معاشی اہمیت ارتکازِ دولت کی روک، چھوٹے سرمایوں کی تشکیل، خواتین کی مالی خود مختاری، سماجی تحفظ اور مالی اعتماد جیسے پہلوؤں میں نمایاں ہے۔ یہ نظام زکاۃ کے ساتھ مل کر اسلامی معیشت کی تقسیمی ساخت مکمل کرتا ہے: زکاۃ زندہ مال دار کے مال سے اور وراثت مرنے والے کے ترکہ سے دولت کو گردش میں لاتی ہے۔ طالب علم کے لیے اس باب کی تدریسی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ فقہ، قانون اور معاشیات کے باہمی ربط کی بہترین مثال ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com